جناب خورشید احمد ندیم

امریکہ کا عالمی تسلط اور مسلمان

امریکہ کا عالمی تسلط اس عہد کا مسلمہ ہے۔ دنیا کے نقشے سے سوویت یونین کی غیبت کے بعد اب بالفعل اسی کا اقتدار قائم ہے۔ اس وقت کوئی دوسری ایسی قوت موجود نہیں جو امریکہ کے اس عالمی کردار کے لیے خطرہ ہو۔ یہ بات قانون قدرت کے خلاف ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے صاحبان فکر کو اس کا اندازہ ہے کہ دنیا میں توازن کے لیے کسی دوسری قوت کا جلد یا بدیر ابھرنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ وہ وقت سے پہلے ہی ایسے امکان کا سدباب کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کمیونزم کے زوال کے بعد اب سرمایہ داری کو جو چیلنج درپیش ہے، وہ اسلام ہے اور آنے والے وقت میں جو معرکہ برپا ہوگا، اس کا میدان تہذیب وتمدن ہوگا۔ یہ بات اگرچہ مختلف اسالیب میں عرصہ دراز سے کہی جا رہی تھی لیکن ۱۹۹۳ء میں اس وقت یہ باقاعدہ بحث بن گئی جب پروفیسر ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کا تصادم Clash of Civiltions کے عنوان سے "فارن افیرز" میں ایک مضمون لکھا۔ "فارن افیرز" میں شائع ہونے والے مضامین کے بارے میں عمومی رائے یہی ہے کہ وہ امریکہ کی سرکاری پالیسی کا مظہر ہوتے ہیں۔

پچھلے کئی سالوں سے بالخصوص سوویت یونین کے زوال کے بعد مغرب اور امریکہ میں ایک مربوط اور منظم مہم کے تحت اسلام کو وحشت وبربریت کی علامت اور انسانی تہذیب کے لیے خطرہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ چونکہ ان کے تسلط میں ہیں اس لیے وہ اس مقصد کے لیے مختص ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ اصطلاحیں جو خالصتاً عیسائیت کے پس منظر میں وضع کی گئی تھیں، انہیں مسلمانوں کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر فنڈا منٹلزم Fundamentalism کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی لکھا ہے کہ یہ عیسائیت کے پس منظر میں پیدا ہونے والی اصطلاح ہے لیکن آج امریکہ کا سابق نائب صدر ڈین کوئل Dane Qayle ریڈیکل اسلامک فنڈا منٹلزم کو دنیا کے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھتا ہے اور اس کو نازی ازم اور کمیونزم کی مثل قرار دیتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغرب اور امریکہ اپنا غلبہ قائم رکھنے کے لیے اس تاثر کو قائم رکھنے میں ایک حد تک کامیاب رہے ہیں لیکن اس عالم کے پروردگار نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ حق پر مستقلاً پردے نہ ڈالے جا سکیں اور وہ کہیں نہ کہیں سے نمودار ہوتا رہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کبھی سیاہ بادلوں سے آفتاب رونما ہوتا ہے اور زمین کو نور سے بھر دیتا ہے۔ چنانچہ خود مغرب کے اندر یہ احساس شدت کے ساتھ پیدا ہو رہا ہے کہ یہ ایک مصنوعی فضا ہے جو ایک خاص تہذیب کو غالب رکھنے اور ایک مخصوص قوت کے عالمی تسلط کو قائم رکھنے کے لیے دانستہ پیدا کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایڈورڈ سعید نے ۱۹۸۱ء میں Covering slam میں یہ بات نمایاں کی تھی کہ مغربی ذرائع ابلاغ کس طرح مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں حقائق کو مسخ کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ امریکہ نے اپنے غلبے کو برقرار رکھنے کے لیے یہ حکمت عملی کیوں اختیار کی اور اس ضمن میں اسلام کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس سوال کے جواب کا ایک فکری پہلو ہے اور ایک عملی۔ فکری اعتبار سے دیکھئے تو یہ بات قانون قدرت کے خلاف ہے کہ عالمی سطح پر ایک ہی قوت غالب رہے جیسا کہ ہم نے ابتدا میں عرض کیا۔ مغربی فکر وفلسفے میں بھی یہ بات کسی اور تناظر میں تسلیم کی جاتی ہے۔ ہیگل کا مشہور فلسفہ ہے کہ ہر نظریے Thesis کا ایک جوابی نظریہ Anti Thesis ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان تصادم ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں ایک تیسرا نظریہ Synthesis وجود میں آتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہ تیسرا نظریہ، پھر ایک نظریے میں Thesis میں ڈھل جاتا ہے اور یہ عمل ایک مرتبہ پھر شروع ہو جاتا ہے۔ اب اس نظریے کو موجودہ حالات پر منطبق کیجئے۔ سرمایہ داری ایک نظریہ Thesis تھا اور اشتراکیت Anti Thesis۔ ان کا تصادم ہوا اور ایک تیسرا نظریہ Synthesis وجود میں آیا جو اس وقت دنیا میں رائج ہے۔ موجودہ عالمی نظام اگرچہ بحیثیت مجموعی سرمایہ دارانہ نظام ہے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ یہ اس سرمایہ داری سے بہت مختلف ہے جو کمیونزم کے ظہور سے پہلے دنیا میں موجود تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ کمیونزم کے چیلنج نے اس کے زہر میں بہت کمی کر دی ہے۔ آج دنیا میں مزدور کے حقوق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مغرب میں کم از کم معاوضے کی شرح متعین ہے۔ سٹیٹ کو ایک فلاحی ریاست Welfare state بنا دیا گیا ہے۔ یہ سب باتیں انسانیت پر کمیونزم کے احسانات شمار ہوں گے۔ لہٰذا آج ہم جس نظام کے تحت زندہ ہیں، یہ غالب حیثیت میں سرمایہ دارانہ رجحانات کا

حامل ہے لیکن اسے ہم ایک نیا نظام سماجی سرمایہ داری Social capitalism قرار دے سکتے ہیں جو ہیگل کے فلسفے کے تحت synthesis قرار پائے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اب ایک نظریے Thesis کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اب لازماً ایک جوابی نظریہ ابھرنا ہے جو بنیادی طور پر اس نظام کی خرابیوں سے جنم لے گا۔ اس سے بچنے کی ایک صورت یہ ہے کہ مصنوعی طور پر ایک جوابی نظریہ Anti Thesis پیدا کیا جائے اور پھر اس سے کچھ خطرات منسوب کر کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ چونکہ جوابی نظریہ زیادہ خطرناک ہے اس لیے اسی نظریے کو اس کی خرابیوں کے ساتھ قبول کیا جائے۔ چنانچہ ایک طرف "اختتام تاریخ" End of history کا تصور دے کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ انسان نے دنیا میں جو تہذیبی ارتقاء کرنا تھا' وہ کر چکا ہے اور اس کے بعد کوئی منزل نہیں جسے سر کرنا ہے۔ لہٰذا اب اصل کمال یہ ہے کہ اس صورت حال کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے۔ دوسری طرف اسلام کو خطرہ بنا کر اس سے ڈرایا جائے۔ اس مقصد کے لیے اسلام کا انتخاب کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت سرمایہ داری اور اشتراکیت کے بعد اگر دنیا میں کوئی تیسرا نظریہ ایسا ہو سکتا ہے جو عالمی سطح پر اثر ورسوخ رکھتا اور انسانیت کے انفرادی واجتماعی مسائل کا کوئی حل پیش کرتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے۔ اس وقت دنیا کا ہر پانچواں آدمی مسلمان ہے اور یہ دنیا میں سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلنے والا مذہب ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان دنیا بھر میں مغلوب ہیں اور کہیں بھی ان کی یہ حیثیت نہیں کہ وہ سیاسی طور پر کوئی چیلنج بن سکیں۔ ان کا اجتماعی نظام یعنی ان کی سیاست' ثقافت' معاشرت' معیشت غرض ہر چیز امریکہ کے رحم وکرم پر ہے۔ لہٰذا اگر وہ اسلام کو خطرہ بنا کر پیش کر رہے ہیں تو جانتے ہیں کہ در حقیقت انہیں اسلام اور مسلمانوں سے کوئی خطرہ نہیں اور یہی بات میرے نزدیک اس مسئلے کا عملی پہلو ہے۔

اس مسئلے کا دلچسپ اور اہم پہلو یہ ہے کہ آج اگر اسلام اور مسلمانوں کو مغرب میں خطرہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے تو اس کی عملی شکل کیا ہے۔ ایک ڈیڑھ سال پہلے جرمن زبان میں ایک کتاب چھپی جس کا انگریزی ترجمہ "اگلا خطرہ" The Next Threat کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے پہلے باب میں ایک فری لانس صحافی انڈریا لیوگ Andrea Lugg نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ اس وقت مغرب اور امریکہ میں اسلام کو کس رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کے خیال میں عیسائیت اہل مغرب کے لیے مذہب سے زیادہ ایک

تہذیب ہے۔ وہ اسلام کو تہذیب کے بجائے ایک مذہب سمجھتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ بنیاد پرستی کا سابقہ لگا کر اس کو ایک خاص شکل دے دی جاتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے "مذہبی جنگوں" کا تصور دیا جاتا ہے۔ انہوں نے بطور حوالہ ٹائم میگزین ۴ اکتوبر ۱۹۹۳ء کا ذکر کیا ہے جس میں نماز پڑھتے ہوئے مسلمانوں کی ایک تصویر دکھائی گئی ہے جس کے نیچے لکھا ہے "بنیاد پرستی کے معرکے میں نماز اور بندوقیں ساتھ ساتھ ہیں۔" پھر اہل مغرب کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ترقی پذیر دنیا جس کی اکثریت مسلمان ہے' کی آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور وہ مغرب کا رخ کر رہے ہیں۔ چنانچہ امیگریشن کو ایک بڑا مسئلہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ "پچاس ملین ایرانیوں کی نصف آبادی کی عمر پندرہ سال سے کم ہے۔ ترکی میں ۱۹۵۰ء کے بعد سے آبادی بیس سے پچاس ملین ہو گئی ہے۔ الجزائر کی آبادی ۲۵ ملین ہے جبکہ ۱۹۶۲ء میں وہاں محض ۱۰ ملین افراد آباد تھے۔ مصر میں پچھلے پچاس سال میں آبادی تین گنا ہو گئی ہے۔ شمالی افریقہ کی طرف سے جنوبی یورپ پر دباؤ میں اضافہ ہو رہا ہے۔"

اسلام کے معاشرتی آداب بالخصوص پردہ اور عورتوں کا اجتماعی کردار بھی بطور خاص زیر بحث ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام عورت کو گھر میں قید کر کے رکھنا چاہتا ہے۔ اس میں تعدد ازدواج' اختلاط مرد وزن جیسے مسائل بھی زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ انڈریا نے ایک اور دلچسپ بات یہ بتائی ہے کہ اہل مغرب چونکہ روایتی طور پر "دشمن" کو خود سے مختلف دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے انہیں دانستہ ایسا ہی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مشرق وسطیٰ کے بازار' مساجد' لوگوں کا لباس وغیرہ کو ایک خاص زاویے سے پیش کیا جاتا ہے۔

اس فہرست میں ظاہر ہے کہ اضافہ ہو سکتا ہے کیونکہ اسلام کے بارے میں مغربی تصورات کا یہ دائرہ معاشرت' معیشت اور سیاست کے بہت سے مسائل پر محیط ہے۔

مسلمانوں کو اگر دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ رہنا ہے تو انہیں ان سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ دنیا کا دستور ہے کہ کھیل کے قواعد و ضوابط وہی لوگ طے کرتے ہیں جو اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس وقت یہ تو نہیں کر سکتے کہ عالمی تسلط اور غلبے کے اس معرکے میں اپنی مرضی کے ایجنڈے پر اصرار کریں تاہم ہم یہ واضح کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف فرد جرم عائد کرنے میں کہاں کہاں انصاف کا خون کیا گیا۔ مثال کے طور پر ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب Covering Islam کے نئے ایڈیشن کے ابتدائیے میں جو حال ہی میں شائع ہوئی' نیو یارک ٹائمز کی رپورٹر جوڈتھ ملر کی مسلمانوں اور مشرق وسطیٰ سے متعلق ضخیم

کتاب کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کس طرح یہ کتاب مضحکہ خیز حد تک غلط معلومات پر مشتمل ہے۔ مصنفہ عربی زبان کا ایک لفظ تک نہیں جانتیں اور عربی الفاظ کا غلط ترجمہ کرتی ہیں۔ اسی طرح عیسائیوں کو مسلمان اور مسلمانوں کو عیسائی بتاتی ہیں۔

اس عالمی چیلنج کا جواب دینے کے لیے جو تہذیبی بھی ہے اور سیاسی بھی، علمی بھی ہے اور عملی بھی، معاشی بھی ہے اور معاشرتی بھی، مسلمانوں کو ایک لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ ہمارے نزدیک اس لائحہ عمل کے تین اجزاء ہیں۔ ایک علمی، دوسرا سیاسی اور تیسرا دعوتی واصلاحی۔ یہ معرکہ ظاہر ہے کہ وہی لوگ لڑ سکتے ہیں جو اس کا شعور رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں دین کا حکم بھی یہی ہے کہ وہی لوگ کسی خاص ذمہ داری کے مکلف ہوتے ہیں جو اس کا شعور رکھتے ہیں اور پھر اپنی افتاد طبع کے اعتبار سے اپنے لیے میدان عمل کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ نہ تو دین کا حکم ہے اور نہ ہی عملاً ممکن ہے کہ ایک فرد بیک وقت میدان کارزار میں شمشیر بدست ہو، علم وحکمت کی دنیا میں مصروف جہاد ہو اور ساتھ ہی وعظ ونصیحت کی مجلس بھی برپا کیے بیٹھا ہو۔ لہٰذا امریکہ کے خلاف اعلان جنگ سے پہلے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس کی حکمت عملی کیا ہو اور اس کی علمی وفکری بنیادیں کیا ہیں؟

(روزنامہ جنگ لاہور ۲۸ نومبر ۹۷ء)

امریکہ میں کم عمر ماؤں کی بوائے فرینڈز سے شادی کی سکیم

لندن (جنگ نیوز) امریکہ میں شادی سے قبل جنسی تعلقات کے نتیجے میں ماں بننے والی نو عمر لڑکیوں اور ان کے بوائے فرینڈز کو شادی کے بندھن میں باندھا جا رہا ہے۔ امریکی ریاست کیلی فورنیا کی اورنج کاؤنٹی میں حالیہ مہینوں میں ۱۵ ایسی لڑکیوں کی سوشل سروس کی جانب سے ان کے بچوں کے باپوں سے شادی کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض لڑکیوں کی عمر صرف ۱۳ سال ہے۔ کاؤنٹی کے سوشل سروسز ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ لیری لیمین کے مطابق اس اسکیم کا مقصد لڑکیوں کی زندگی تباہ ہونے سے بچانا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا مقصد پیسوں کی بچت نہیں بلکہ کم عمر ماؤں کی تعداد میں کمی لانا ہے۔ واضح رہے کہ کیلی فورنیا میں ملک بھر میں سب سے زیادہ کم عمر لڑکیاں مائیں بنتی ہیں۔ بعض حلقوں نے اس اسکیم پر اعتراض کیا ہے تاہم حکومت کا کہنا ہے کہ کم عمر لڑکیوں کو حاملہ کرنے کے ذمہ داروں کو ان کے بچوں کا باپ بننے کی ذمہ داری بھی قبول کرنی چاہیے۔

(روزنامہ جنگ لندن۔ ۱۰ ستمبر ۹۶ء)